© rasailojaraid.com

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں (اقبال)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحؒ کی ذات بابرکات بلا مبالغہ انیسویں صدی کی ایک ایسی باکمال اور عظیم ہستی تھی جو صدیوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتی ہے اور زمانے پر اپنے نہ مٹنے والے گہرے اور ہمہ گیر اثرات چھوڑ کر جاتی ہے۔ میرا یہ منصب کہاں کہ اس عظیم المرتبت اور یگانۂ روزگار ہستی کے محاسن اور صفات گنا کر بتا سکوں کہ وہ کیا تھی اور کتنی بڑی تھی، علم و عمل انسانیت و مروت کے کس بلند درجہ پر فائز تھی، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں اسے کتنا زبردست کمال حاصل تھا، اس کے اخلاق کتنے وسیع، اس کے اعمال کس قدر پاکیزہ اور بہر نوع اس کی شخصیت کتنی جامع، مکمل اور ہمہ گیر تھی۔ اس مختصر سے مضمون میں اگر میں اس جلیل القدر ہستی کی زندگی کے مختصر حالات اور موٹے موٹے واقعات بتا کر، اس کی حقیقی عظمت کی ایک ہلکی سی جھلک ہی دکھا سکوں تو اپنے کو کامیاب سمجھوں گا۔

حضرت شیخ الہند رحؒ قصبۂ دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک معزز خاندان میں جس کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ سے ملتا ہے، ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے، اور محمود حسن آپ کا نام رکھا گیا۔ آپ کے والد ماجد ذوالفقار علی صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور نہایت ہی صاحب اقبال و ذی وجاہت انسان تھے۔ والدہ ماجدہ دیوبند کے ایک معزز شیخ بو علی بخش صاحب کی صاحبزادی اور نہایت سخی، خدا ترس اور منتظم عورت تھیں۔ شفیق ماں باپ نے نہایت ہی محبت و پیار کے ساتھ آپ کی پرورش کی۔ چھ سال کی عمر ہوئی تو آپ کی تعلیم شروع کرائی گئی۔ فارسی کی تمام کتابیں اور ابتدائی عربی آپ نے گھر پر ہی اپنے محترم چچا مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھی۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو جبکہ آپ کی عمر پندرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سال کی تھی دار العلوم (دیوبند کا مشہور مدرسہ) کھل گیا اور اپنی بقیہ تعلیم آپ نے اسی مدرسہ میں مکمل کی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ بانی دار العلوم، آپ کے استاذ خصوصی ہیں۔ آپ نے اپنے قابل اور فخر زمانہ اُستاد سے صحاح ستہ (احادیث کی مشہور کتب) اور دیگر فنون کی اعلیٰ کتابیں، سفر و حضر میں ساتھ رہ کر اس محنت و توجہ سے پڑھیں، پھر اس ہونہار ذکی اور ذی استعداد شاگرد پر شفیق استاد کی نظر عنایت بھی کچھ ایسی ہوئی کہ بہت جلد علوم عقلیہ و نقلیہ میں آپ کو کامل دستگاہ حاصل ہوگئی اور ابھی آپ فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسی مدرسہ میں بطور معاونِ استاذ درس بھی دینے لگے اور ۱۲۹۵ھ میں تعلیم سے فراغت کے بعد تو آپ کا شمار باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں ہونے لگا۔ ۱۳۰۵ھ میں آپ باتفاق آراء صدر مدرس مقرر ہوئے اور اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۲۹ھ تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس تمام عرصہ میں آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ مسلسل تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دئیے اس نے دار العلوم کو درحقیقت دار العلوم بنا دیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دار العلوم نے علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کے جس بلند مقصد کو سامنے رکھ کر اس مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی، اُس کی تکمیل کا سہرا ان کے اسی شاگردِ رشید کے سر ہے جسے دنیا نے حضرت شیخ الہند کے لقب سے پکارا اور جس کے علم و فضل اور زہد و ورع کا چرچہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلا۔

آپ کو علوم عقلیہ و نقلیہ بالخصوص علمِ حدیث میں جو غیر معمولی تبحر حاصل تھا، آپ کے حلقۂ درس کی جو خاص شان تھی، اور طرز تحدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک خاص کا جو اثر آپ پر تھا، گنجائش نہیں ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان تمام باتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا جاسکے۔ ویسے تو آپ کے کمال تبحر کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی نے آپ کو اجازتِ حدیث مرحمت فرمائی تھی۔ لیکن درس و تدریس اور قراءت و تحدیث کے لحاظ سے آپ کی سند حدیث دو طرح سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک اور ان کے اساتذۂ کرام کے ذریعہ سے حضرت محدثین اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اول :- عن مولانا الشیخ محمد قاسم، عن مولانا شیخ عبد الغنی عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبد العزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

ثانی :- عن مولانا الشیخ احمد علی السہارنفوری، عن مولانا شاہ محمد اسحاق، عن مولانا الشاہ عبد العزیز، عن مولانا شاہ ولی اللہ

حضرت شیخ الہندؒ نے ۴۴ سال تک مسلسل ایک مرکز پر جم کر، درس و تدریس اور اشاعت علوم دینیہ کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کی مثال اس زمانے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی شاذ و نادر ہی ملے گی آپ کے ایسے شاگردوں کی تعداد جو باقاعدہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں ایک ہزار سے بھی زائد ہوتی ہے۔ اور غیر فارغ التحصیل یا بالواسطہ شاگردوں کی تعداد کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہندوستان کے علاوہ کابل، قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے فیوض سے مالامال ہو کر گئے۔ ویسے تو آپ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے والوں میں ایک سے ایک جوہر قابل پیدا ہوا اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر آفتاب و ماہتاب بن کر علم دین کی روشنی پھیلائی۔ لیکن آپ کے ممتاز ترین شاگردوں میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری رحمہم اللہ، حضرت مولانا حسین احمد مدنی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہم کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علمائے کرام کے طبقہ میں یہ حضرات فضیلت و امتیاز کے جس بلند مقام پر فائز ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اسی سے اُس "مرد کامل"، کی عظمت و جلالت کا اندازہ کر لیجئے جس کے فیضانِ نظر نے ایسی ممتاز اور اعلیٰ شخصیتیں پیدا کر دیں۔

علومِ ظاہری کی طرح علوم باطنی میں بھی حضرت شیخ الہند کو درجۂ کمال حاصل تھا، اور آپ اپنے وقت کے باکمال صوفی اور عارف تھے۔ آپ کی مشہور و معروف نسبتِ بیعت تو اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ہے جنہوں نے چاروں سلسلوں میں آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اجازت بیعت فرمائی، لیکن جس سال آپ اپنے استاذ و مرشد اور حضرت گنگوہیؒ وغیرہ کی معیت میں حج بیت اللہ کی غرض سے تشریف لے گئے تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی درخواست پر حضرت مولانا حاجی امداد صاحب مہاجر کی قدس سرہٗ نے بھی آپ کو شرفِ بیعت سے نوازا اور خلافت و اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔

گنجائش نہیں ہے کہ آپ کی عبادت و ریاضت، اتباعِ سنّت اور سلوک و معرفت کے واقعات کو یہاں تفصیل سے پیش کیا جائے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ ان تمام صفات میں اپنے اکابر سلف کا مکمل اور بہترین نمونہ تھے۔ آپ نے اتباعِ سنّت اور عمل بالشریعت کے ذریعہ طریقت کو پالیا تھا، احکامِ اسلامی پر عمل کرتے ہوئے درجۂ احسان تک پہنچ گئے تھے اور تعبدُ اللہ کانک تراہُ کے بلند مقام پر فائز تھے کہ تصوف کا صحیح مقام اور طریقت کا حقیقی مقصود بھی یہی ہے۔

حضرت شیخ الہند اپنے وقت کے ایک بہت بڑے متبحر عالم اور باکمال صوفی ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست مجاہد، انقلابی اور امام سیاست بھی تھے، آپ کے دل میں ملت اسلامیہ کی خیرخواہی اور استخلاص وطن کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا اور آپ کی تمام زندگی میں اس جذبہ کی پوری پوری کارفرمائی نظر آتی ہے، تعلیم و تدریس اور ارشاد و ہدایت کے خاموش اور قابلِ قدر فرائض کے ساتھ ساتھ آپ نے آزادئ وطن اور سیاست ملی کے سلسلہ میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں ان پر اگرچہ اب تک ایک پردہ سا پڑا ہوا ہے، لیکن یقین ہے کہ اگر آئندہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی کوئی صحیح تاریخ لکھی گئی تو اس میں حضرت شیخ الہند کی سیاسی جدوجہد اور انقلابی کارناموں کا غیر معمولی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ آئندہ صفحات میں میں کوشش کروں گا کہ حضرت شیخ الہند کی زندگی کے اس خاص اور اہم پہلو یعنی سیاسی پہلو کو ذرا نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔

حضرت شیخ الہند کی انقلابی اور سیاسی کوششوں پر نظر ڈالنے سے پہلے، یہاں ایک بنیادی بات کا واضح کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حضرت شیخ الہند حزب ولی اللہ کے ایک فرد تھے اور یہ تحریک درحقیقت ولی اللہی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اس اجمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تفصیل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے :

"حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۵ رمئی ۱۷۳۱ء کو ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا، اپنے پروگرام کی تدوین کی، جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں قائم کی گئیں۔

یہ تحریک ولی اللہی کا پہلا دور ہے اس میں تین امام ظاہر ہوئے اور ایک حکومت موقتہ قائم ہوئی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) امام ولی اللہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۶۳ء

(۲) امام عبد العزیز ۱۷۶۳ء تا ۱۸۲۴ء

(۳) امام محمد اسحاق ۱۸۲۴ء تا ۱۸۴۶ء

موقتہ حکومت کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۴ء تا ۱۸۳۱ء

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک العلی تھے۔ ان کے بعد الامیر امداد اللہ نائب بنے وہ بارہ برس یعنی ۱۸۵۸ء تک دہلی میں رہے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک، شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۹۲۰ء تک

تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑے عرصے پہلے شروع کیا تھا۔"

مذکورہ بالا بیان سے ولی اللہی تحریک کے مختلف ادوار کا سرسری خاکہ سامنے آجاتا ہے ایک جگہ دیوبندی جماعت کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سندھی تحریر فرماتے ہیں :-

جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لئے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے، استاذ اساتذۃ الہند مولانا مملوک العلی صدر مدرس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے بعد مولانا اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کیلئے مقرر کیا.......... اس جماعت کی مرکزی قوت (ہنگامہ ۵۷ء کے بعد) دو حصوں میں تقسیم ہوگئی - اور دہلی کے عوض، دیوبند اور علیگڑھ دو مرکز بن گئے - مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصے کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خان نے دہلی کالج کے انگریزی حصے کو علیگڑھ پہنچا دیا - (سر سید اور مولانا محمد قاسم دونوں مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے) کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کرسکتی تھی - اس لئے اُس نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا مگر دیوبندی جماعت نے جو مولانا اسحاق کے زمانے سے دولت عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کو اپنا مسلک نہ بنایا لیکن یہ غیر جانبداری بھی اُس وقت قطعاً ختم سمجھی جائے گی جب دولت عثمانیہ اور دولت برطانیہ میں لڑائی ٹھن جائے -

دیوبند کے مدرسہ کا قیام بھی اس صورت سے عمل میں آیا :-

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد ولی اللہی تحریک کے ارباب حل وعقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سر نو شاہ عبدالعزیز کے نمونے کا مدرسہ قائم کیا جائے جو ولی اللہی تحریک کا مرکز بن سکے - چنانچہ سقوط دہلی کے نو برس بعد ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں دہلی کے قرب میں دیوبند کے مقام پر مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی - اس مدرسہ کا بنیادی خیال حاجی امداد اللہ نے مکہ معظمہ میں سوچا تھا اور مولانا محمد قاسم سات سال مسلسل اس کوشش میں رہے کہ اپنے استاد اور مرشد کے خیال کو عمل میں لائیں - مدرسۂ دیوبند کا نصاب تعلیم، نظام عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے مرتب کئے اور اس طرح انہوں نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ اور ولی اللہی تحریک کے مقاصد کو دیوبندی نظام میں محفوظ کردیا -

مذکورہ بالا بیانوں سے دیوبندی جماعت اور دیوبندی تحریک کی صحیح حیثیت بالکل واضح ہوجاتی ہے یعنی یہ کہ دیوبندی جماعت دراصل "حزب ولی اللہ" ہی کا دوسرا نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دیوبندی تحریک، ولی اللٰہی تحریک ہی کی ایک شکل ہے۔ مدرسۂ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور جو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وفات (۱۹۰۵ء) پر ختم ہوتا ہے، صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لئے مخصوص رہا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی صدارت میں دارالعلوم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جبکہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبہ، ہزاروں کی تعداد میں ملک کے گوشہ گوشہ اور بیرون ملک میں بھی پھیل جاتے ہیں، جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم ہو جاتی ہیں اور دارالعلوم کی علمی تحریک وسیع سے وسیع تر ہو جاتی ہیں اب وقت آجاتا ہے کہ اکابر سلف کے نقش قدم پر چل کر آزادیٔ وطن کی جدوجہد کا از سر نو آغاز کیا جائے اور دارالعلوم کے حقیقی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کی تکمیل میں آخر دم تک مصروف رہے۔

حضرت شیخ الہند نے انقلاب کا ایک مکمل خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا اور اس کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ علمائے دیوبند کی کثیر اور منتشر تعداد کو ایک اجتماعی حیثیت سے منظم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۸ء میں اسی غرض سے "ثمرۃ التربیت" کے نام سے فضلا اور بہی خواہان دارالعلوم کی ایک جماعت قائم کی گئی جو ایک عرصہ تک اپنا کام کرتی رہی لیکن بعد میں اس کا کام کچھ سست پڑ گیا، اس لئے ۱۹۰۹ء میں "جمعیۃ الانصار" کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کے ماتحت دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہو گئی۔ اس نظام میں جس طرح ہندوستانی علماء، داخل ہوئے، اسی طرح افغانی اور ترکستانی علما بھی شامل ہو گئے۔

دیوبندی جماعت کی تنظیم کے بعد حضرت شیخ الہند کے پیش نظر دوسرا اہم کام یہ تھا کہ کسی صورت سے علی گڑھ پارٹی کے انقلابی عنصر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جائے، اور علما اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے دیرینہ تفرقہ کو ختم کر کے کوشش کی جائے کہ دیوبند اور علیگڑھ پارٹی کے حریت پسند افراد باہم مل کر کام کریں، تا کہ ملت اسلامیہ منظم ہو کر ایک متحدہ قیادت کے ماتحت آزادیٔ اسلام اور آزادیٔ وطن کی طرف قدم بڑھا سکے۔ اسی مقصد کے ماتحت حضرت شیخ الہند نے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور انگریزی کالجوں کے دوسرے نوجوانوں سے تعلقات پیدا کئے، انہیں اپنا ہم خیال و ہم راز بنایا اور اس طرح آپ کی مساعی سے دیوبند اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علیگڑھ والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور دونوں مرکزوں کے حریت خواہ افراد نے مل کر اسلامی ہند کی متحدہ قیادت کی بنیاد ڈالی، اسلامی ہند کی سیاست پر حضرت شیخ الہند کی ذاتِ گرامی کا یہ کچھ کم احسان نہیں۔

علیگڑھ اور دیوبند کے اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے جمعیۃ الانصار کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی قرار دیا گیا کہ علیگڑھ کے طلبہ دیوبند میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لئے آسانیاں مہیا کی جائیں اور دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی پڑھنا چاہیں تو علی گڑھ میں ان کے لئے انتظام ہو۔

حضرت شیخ الہند اپنی انہی کوششوں میں مصروف تھے کہ ۱۹۱۲ء میں طرابلس و بلقان کے خونیں حوادث نے ملت اسلامیہ کو ایک نئی مصیبت سے دوچار اور حضرت شیخ کے قلب مضطر کو اور بھی بے چین و مضطرب کر دیا۔ اس وقت ترکوں کی امداد میں آپ نے پوری جان توڑ کوشش کی، فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کر دیا، طلبہ کے وفود اطراف ملک میں بھیجے خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے کئے اور ایک اچھی خاصی رقم اعانت کے طور پر بھجوائی۔

بلقان و طرابلس کے خونیں حوادث کے اثرات ابھی تازہ ہی تھے کہ ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے سانحہ نے مسلمانان ہند میں ایک عجیب بے چینی اور انگریز دشمنی کا ایک عام اور شدید جذبہ پیدا کر دیا اور ہر طرف سے آزاد حکومت کے قیام کا مطالبہ ہونے لگا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر، جمعیۃ الانصار کے قیام کے ٹھیک چار سال بعد دہلی میں "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا جہاں نوجوانانِ ہند کو درس سیاست دیا جانے لگا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ان تمام کاموں میں مولانا سندھی مرحوم ان کے دست راست تھے۔

دیوبندی جماعت کی تنظیم اور پھر دیوبند اور علی گڑھ کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر دینے کے بعد حضرت شیخ الہند اپنے انقلابی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے برادران وطن کے اشتراک عمل کی بھی ضرورت محسوس کر رہے تھے، چنانچہ راجہ مہندر پرتاب اور ان کی پارٹی کے ساتھ رابطہ اسی نظریہ کا عملی پہلو تھا۔

اندرون ملک کی زمین ہموار ہو چکی تھی اور اب انقلابی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے بیرونی ممالک سے روابط و تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت شیخ الہند اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہی تدابیر میں مشغول تھے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور برطانوی حکومت نے دولت عثمانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حضرت شیخ الہند کی جماعت، حضرت شاہ اسحٰق صاحب کے تتبع میں طبعی طور پر انگریزوں کے خلاف اور ترکوں کے ساتھ تھی اس وقت دولت عثمانیہ کی امداد تو ضروری تھی ہی، اس کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہند کے لئے اپنے انقلابی پروگرام کو اسلامی ممالک کے تعاون سے کامیاب بنانے کا بھی یہ عمدہ موقع تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند نے ایک طرف تو مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لئے بھیجا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ سے تعلقات قائم کرنے کے لئے جو انقلابی پروگرام کی تکمیل کے لئے ازبس ضروری تھا، خود سفر حج اختیار کیا۔

کابل پہنچ کر مولانا سندھی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ادھر حضرت شیخ الہند نے مکہ معظمہ پہنچ کر غالب پاشا (گورنر مکہ) سے اور پھر مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں، اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی اور تمام معاملات طے ہو گئے۔

اس کے بعد آپ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ اور پھر مکہ معظمہ سے طائف پہنچے اور چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد استنبول پہنچنے کی صورت نکالیں کہ اسی اثناء میں شریف کی بغاوت کا واقعہ پیش آگیا اور حضرت شیخ مع اپنے رفقاء کے ایک عرصہ کے لئے طائف میں گھر کر رہ گئے اور بمشکل تمام مکہ پہنچے تھے کہ حکومت برطانیہ کو آپ پر شبہ ہو گیا اس نے اپنا مجرم قرار دے کر آپ کو مع رفقاء کے شریف حسین سے طلب کر لیا۔ شریف حسین کی برطانیہ سے دوستی ہو ہی چکی تھی، پھر اسے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی طرف سے، اس بنیاد پر کہ آپ نے ترکوں کی تکفیر کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا، کافی بدگمان اور بددل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس نے بڑی خوشی سے حکم نافذ کر دیا کہ "ہندی عالم اور ان کے رفقاء جدہ بھیج کر افسران برطانیہ کی حفاظت میں دیدیئے جائیں"۔ بالآخر اس حکم کی تعمیل ہوئی اور حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کو اونٹوں پر سوار کرا کر مسلح گارڈ کی حفاظت میں جدہ روانہ کر دیا گیا۔ جدہ سے کچھ دن کے بعد ان حضرات کو جیزہ (متعلقات قاہرہ) کے سیاسی جیل خانہ پہنچا دیا گیا، جہاں حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کے باری باری بیانات لئے گئے، سب کو یقین ہو گیا تھا کہ پھانسی کا حکم ہو گا مگر بظاہر ثبوت فراہم نہ ہو سکا اس لئے پھانسی سے نجات ملی اور مالٹا میں نظر بند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کئے جانے کا فیصلہ ہوا۔

حضرت شیخ الہند کی یہی انقلابی اسکیم ہے جسے گورنمنٹ کے کاغذات میں "ریشمی خطوط کی سازش" کا نام دیا گیا۔ آپ کی اسکیم قطعی طور پر کامیاب تھی، مگر افسوس کہ عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی اچانک شکست نے اسے ناکام بنا دیا۔ واقعہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد "حزب ولی اللہ" کی یہ تیسری انقلابی کوشش تھی جو بالآخر ناکام ہوئی لیکن اس ناکامی کا نتیجہ مایوسی یا پست ہمتی نہ تھا بلکہ حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد نئے حوصلہ اور نئی امنگ کے ساتھ ایک نئے اقدام کا عزم بالجزم۔

چنانچہ حضرت شیخ الہند (مئی ۱۹۲۰ء) میں مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تو اپنے ساتھ ایک نیا سیاسی پروگرام لائے جو ممالک اسلامیہ کے مفاد، ملکی حالات اور بین الاقوامی سیاست کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ تمام حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد حضرت شیخ الہند اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اب جبکہ جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کی شکست کے بعد کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز باقی نہیں رہا اور اسلامی ممالک کے تعاون سے ملک کو آزاد کرانے کی پالیسی ناقابل عمل ہو چکی ہے، آزادئ وطن کی صرف ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی ممالک کی سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے ہندوستان کو اپنی توجہات کا تمام تر مرکز بنایا جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ملک کو غلامی کے پنجہ سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے اپنی جماعت کے سامنے جو پروگرام رکھا اس کے اہم اجزا یہ تھے:

(۱) دیوبندی اور علیگڑھ پارٹی مل کر کام کرے۔

(۲) انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی جائے اور بیرونی ممالک کی سیاست سے علیحدگی اختیار کی جائے۔

(۳) دیوبندی جماعت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور مولانا محمد قاسم کی حکمت عملی کو علمی زندگی کا اساس بنائے۔

اس طرح آپ نے اسلامی ہند کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو ملک میں ہندو مسلم اتحاد اور انگریز دشمنی کی ایک عام فضا پہلے ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور گاندھی جی اپنی ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر چکے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کی تشریف آوری اور سیاسی سرگرمیوں نے اس تحریک میں جان ڈال دی، تحریک ترکِ موالات پورے زور شور سے چل پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آیا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے لوگ آج تک ترستے ہیں۔

لیکن یہ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ آپ مالٹا سے تشریف لائے تو مرض الموت کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور ابھی آپ کی تشریف آوری کو پورے سات ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۳۰ رنومبر ۱۹۲۰ھ کو ملک آپ کی رہنمائی اور قیادت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

آپ کے اس غیر معمولی جوش عمل، ہمت و استقلال اور جذبۂ حب قومی کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ علالت کی خطرناک منزل اور نقاہت کی انتہائی کیفیت میں آپ مبتلا ہیں، لیکن پھر بھی سیاسی اور عملی سرگرمیوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ اسی شدید علالت اور انتہائی نقاہت کے عالم میں ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیۂ اسلامیہ کا افتتاح اور انتقال سے صرف آٹھ روز پہلے دہلی میں جمیعتہ العلماء کے دوسرے سالانہ اجلاس کی صدارت فرماتے ہیں۔

جامعہ ملیۂ اسلامیہ کا افتتاح، درحقیقت حضرت شیخ الہند کی آخری زندگی کا ایک ایسا اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے جو بلاشبہ ہماری قومی و ملی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آپ کی نگاہِ دور رس نے اس حقیقت کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ سیاسی آزادی کے نصب العین میں پوری کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اس کی پشت پر آزاد اور قومی نظام تعلیم کی ایک مستقل اور مستحکم طاقت موجود ہو، اسی لئے آپ نے سیاسی آزادی کی تحریک کی قیادت کے ساتھ ساتھ تعلیمی آزادی کی تحریک کی بھی پرزور حمایت کی اور اسی جذبہ کے ماتحت، شدید علالت اور انتہائی نقاہت کے باوجود آپ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند سے علیگڑھ پہنچے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا اور اس طرح علی گڑھ اور دیوبند کو ایک متحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کر دینے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں، ان دونوں کا ایک تعلیمی سنگم بھی قائم کر دیا، تاکہ یہ سنگم ان دونوں طبقوں کی وحدت کو ایک مستقل اور پائدار شکل دے سکے۔

حضرت شیخ الہند کے ذہن میں آزاد تعلیم اور صحیح اسلامی تعلیم کا جو بلند تصور تھا اور آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے جن مخصوص جذبات اور جن دلی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ جامعہ ملیہ کا افتتاح کیا تھا، اس کا اندازہ اس شاندار اور تاریخی خطبۂ صدارت سے کیا جا سکتا ہے، جسے آپ کی علالت و نقاہت کی بنا پر، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ کی طرف سے جلسۂ افتتاح میں پڑھ کر سنایا تھا۔ خطبہ کے بعض اہم اجزاء درج ذیل ہیں، جن سے آپ کے ان تعلیمی تصورات اور مخصوص جذبات پر روشنی پڑتی ہے:-

(۱) "میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا، حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہئے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں، کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔"

(۲) "اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکول اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علیگڑھ کا رشتہ جوڑا.... کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ ...."

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے، کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں، یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں، یا حکومت وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔"

(۲) "مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی۔۔۔ ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اور اغیار کے اثر سے کلیۃً آزاد ہو، کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع واطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں میں غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاذ بناتے۔"

(۳) "ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائیگا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"

حضرت شیخ الہند ہم سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن آپ کے بتائے ہوئے نشان راہ اب بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، آپ نے اپنی قوم میں انقلاب و آزادی کی جو روح پھونکی تھی وہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ، دارالعلوم دیوبند اور اس کی صدہا شاخوں میں اب بھی جلوہ ریز ہے، اور

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں

رات دن گردش میں رہتا ہے ابھی محفل میں ہے

© rasailojaraid.com